An Analytical Study of the Intellectual Themes Presented in the Preface of The Reconstruction of Religious Thought in Islam

"تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" کے دیباچہ میں پیش کردہ فِکری نکات کا تجزیاتی مطالعہ

Dr.Talib Hussain Hashmi *[1]
Post Doctoral Fellowship, Islamic Research Institute International Islamic Univeristy Islamabad, Pakistan

ڈاکٹر طالب حسین ہاشمی ☆[1]
پوسٹ ڈاکٹورل فیلوشپ، اسلامک ریسرچ انسٹیوٹ، انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد، پاکستان

Correspondance: drtalibhashmi@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 24-04-2026
Accepted:26-06-2026
Online:28-06-2026

Copyright:© 2026 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: Allama Muhammad Iqbal is widely regarded as one of the most influential intellectuals of South Asia who attempted to reinterpret and reconstruct Islamic thought in response to the intellectual, philosophical and cultural challenges of the modern world. His seminal work, The Reconstruction of Religious Thought in Islam, represents a landmark in modern Islamic philosophy, where he seeks to harmonize religious understanding with contemporary scientific and philosophical developments. Among the various sections of this work, the preface holds particular significance as it provides a condensed overview of Iqbal's core intellectual concerns and sets the direction for the entire series of lectures. This research paper offers an analytical study of the philosophical ideas presented in the preface of The Reconstruction of Religious Thought in Islam. It explores how Iqbal emphasizes the dynamic, evolving and creative nature of Islamic thought, arguing that Islam should not be understood as a rigid or static system but as a living tradition capable of

continuous reinterpretation through Ijtihad. The study further examines Iqbal's rejection of the perceived dichotomy between religion and rational thought, highlighting his view that both are complementary means of understanding the same ultimate reality. Another key focus of this paper is Iqbal's critique of the modern intellectual crisis shaped by Western philosophy and scientific materialism. He argues that while modern science has significantly expanded human knowledge, it has also contributed to a fragmented worldview that needs to be reconciled with spiritual and ethical dimensions. In this context, Iqbal proposes that Islamic thought can respond to modern challenges by drawing upon its internal intellectual resources, particularly Qur'anic insight, reflective reasoning and creative interpretation. The study also highlights Iqbal's vision of integrating traditional Islamic philosophical heritage with modern intellectual advancements. It concludes that the preface is not merely an introductory section but a concentrated expression of Iqbal's broader philosophical project aimed at reconstructing religious thought in a way that ensures its relevance in the contemporary era.

KEYWORDS: Allama Iqbal; Islamic thought; Reconstruction; Preface analysis; Religion and science; Ijtihad; Modern philosophy; Qur'anic worldview; Intellectual reform; Metaphysical thought.

دانائے راز، حکیم الامت، شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ اسلامی تاریخ کی اُن نابغۂ روزگار شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے برصغیر سمیت پورے عالمِ اسلام کی فکری، مذہبی، فلسفیانہ اور تہذیبی زندگی پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کیے۔ ایسے دور میں جب اُمتِ مسلمہ صدیوں سے سیاسی زوال، فکری جمود، علمی انحطاط اور تہذیبی شکست خوردگی کا شکار تھی، علامہ اقبالؒ نے اپنے فکرِ رسا، عمیق بصیرت اور انقلابی فلسفۂ حیات کے ذریعے مسلمانوں میں خود آگہی، خود اعتمادی، حریتِ

فکر اور عملِ پیہم کا شعور بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اُن کی فکر کا بنیادی مقصد اسلام کی حقیقی روح کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق سمجھنا، مسلمانوں میں اجتہادی صلاحیت کو زندہ کرنا اور قرآن و سنت کی روشنی میں ایک متحرک، زندہ اور ارتقائی اسلامی معاشرے کی تشکیل کی راہ ہموار کرنا تھا۔

علامہ محمد اقبال کی تصنیف "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" اسلامی فلسفۂ حیات کی تجدید و تشکیلِ نو کا ایک اہم سنگِ میل ہے، جس میں اُنھوں نے مذہب، عقل، وحی، انسان، کائنات اور جدید سائنسی فکر کے باہمی ربط و تعلق کو ایک منظم فکری نظام کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ محض ابتدائی تعارف نہیں بل کہ اقبال کے پورے فکری نظام کی کلیدی جہتوں کا خلاصہ بھی ہے۔ اس میں وہ بنیادی تصورات واضح کیے گئے ہیں جو آگے چل کر ابواب کی صورت میں تفصیل اختیار کرتے ہیں۔ اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلامی فِکر کو جامد روایت اور ماضی پرستی کے بجائے ایک زندہ، متحرک اور ارتقائی عمل کے طور پر سمجھا جائے۔ ان کے نزدیک اسلام کا فکری ڈھانچہ ہر دور میں نئی تعبیر اور نئے اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہے، جو اسے زمان و مکاں کی تبدیلیوں کے باوجود قابلِ عمل بناتا ہے۔

دیباچے میں اقبال مذہب اور عقل کے باہمی تعلق کو بھی نہایت اہم فِکری مسئلے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ اس تصور کو رَد کرتے ہیں کہ مذہب اور عقلی فکر ایک دوسرے کی ضد ہیں، بل کہ ان کے مطابق دونوں حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے دو مختلف مگر ہم آہنگ ذرائع ہیں۔ اسی طرح وہ مغربی فلسفہ اور جدید سائنس کے اثرات کے تحت پیدا ہونے والے فکری بحران کا تجزیہ کرتے ہوئے اس اَمر پر بھی زور دیتے ہیں کہ اِسلامی فکر کو ان چیلنجز کا جواب اپنے اندرونی فکری وسائل، خصوصاً اجتہاد اور قرآنی بصیرت کے ذریعے دینا چاہیے۔ اس تناظر میں یہ مقالہ "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" کے دیباچے میں پیش کردہ فکری نکات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش ہے۔ اس کا بنیادی مقصد اقبال کے فکری وژن کو واضح کرنا، دیباچے میں موجود بنیادی تصورات کی توضیح کرنا اور یہ سمجھنا ہے کہ انھوں نے اسلامی فکر کی تشکیلِ نو کے لیے کن فکری اصولوں کو بنیاد بنایا۔

علم بنیادی طور پر جاننے کا نام ہے۔ بعض مفکرین اور دانشوروں کے نزدیک انسانی ارتقا دراصل انسانی علوم کی ارتقا ہے۔ یہ قاعدہ ہمیں فقط عقلی استدلال اور تجربات و مشاہدات سے حاصل ہونے والے علوم میں ہی نہیں بل کہ الہامی مذاہب میں بھی واضح نظر آتا ہے۔ جہاں انسانی تاریخ اور علوم کی ارتقا کے ساتھ دین اپنی تکمیل تک پہنچا ہے۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہونے والے نئے نئے مسائل سے نمٹنے کے لیے دینِ اسلام کے احکامات کی تشریحات و تفاسیر بھی اِرتقاپذیر ہیں اور خاص کر فقہی اِجتہاد، جس نے اِنسانی فکر کی خُفتہ جہتیں متعارف کروائی ہیں اور اِنسانی زیست کے کئی تاریک پہلوؤں کو بھی روشنی بخشی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی اردو اور فارسی شاعری کے ذریعے عشق، خودی، حریت، اجتہاد، انسان کی تخلیقی قوت، روحانی ارتقا اور اسلامی نشاۃِ ثانیہ جیسے موضوعات کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا۔ تاہم اُن کی خدمات صرف شاعری تک محدود نہیں رہیں بل کہ اُن کی نثری تصانیف، خصوصاً فلسفۂ مذہب اور اسلامی فکر سے متعلق تحریریں بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ اقبالؒ نے مشرق و مغرب کے فلسفے کا گہرا مطالعہ کر کے اسلامی الٰہیات کو جدید فکری مباحث کے تناظر میں نئے انداز سے پیش کیا اور یہ واضح کیا کہ اسلام ایک جامد مذہب نہیں بل کہ ایک زندہ، متحرک اور ارتقاپذیر نظامِ حیات ہے۔

اسی سلسلے کی سب سے اہم علمی اور فکری تصنیف "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" یعنی "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" ہے، جو دراصل مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر 1928ء اور 1929ء کے دوران مختلف جامعات میں دیے گئے سات خطبات پر مشتمل ہے۔ ان خطبات میں علامہ اقبالؒ نے مذہب اور عقل، وحی اور سائنس، زمان و مکان، خودی، اجتہاد، اسلامی قانون، روحانی تجربے اور جدید فلسفیانہ مباحث کا نہایت عالمانہ اور تنقیدی جائزہ لیا۔ اُنہوں نے اس امر پر زور دیا کہ اسلامی فکر کی تجدید کا عمل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں اور بدلتے ہوئے حالات میں قرآن و سنت کی ابدی تعلیمات کی روشنی میں نئے مسائل کا حل تلاش کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

"تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" مسلم فکری تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے، کیوں کہ اس کتاب نے جدید دور میں اسلامی فلسفۂ مذہب، علمِ کلام اور دینی فکر کو ایک نئی جہت عطا کی۔ اس تصنیف نے نہ صرف مسلم دانش وروں کو فکری تجدید کا شعور بخشا بل کہ اسلام اور جدید مغربی فکر کے درمیان ایک بامعنی مکالمے کی بنیاد بھی فراہم کی۔ آج بھی یہ کتاب اسلامی فلسفے، الٰہیات، علمِ کلام اور اقبالیات کے محققین کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے اور مسلم دنیا میں فکری بیداری، اجتہادی شعور اور اسلامی احیاء کی ایک مؤثر علمی دستاویز سمجھی جاتی ہے۔ خُطباتِ اقبال میں اسلامی فکر و فلسفہ کے متعدد بنیادی اور ہمہ گیر موضوعات، مثلاً وحی، عقل، اجتہاد، خودی، زمان و مکان، روحانی تجربہ، اسلامی قانون اور جدید سائنسی و فلسفیانہ مباحث کو نہایت گہرائی اور استدلال کے ساتھ زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ تاہم ان خطبات کی تفصیلات میں جانے سے قبل ان کا دیباچہ ہی اس فکری و تجدیدی تحریک کا آئینہ دار ہے جسے علامہ اقبالؒ نے مسلم دنیا کی فکری بیداری اور احیائے اسلام کے لیے ناگزیر قرار دیا۔ یہ دیباچہ محض تمہیدی کلمات نہیں بل کہ ایک ایسے فکری منشور کی حیثیت رکھتا ہے جو مسلمانوں کو روایت پرستی اور فکری جمود سے نکل کر اجتہادی شعور، علمی تحقیق اور تخلیقی فکر کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مسلم مفکرین، متکلمین اور فلاسفہ کا یہ نمایاں وصف تھا کہ وہ اپنے عہد کے فکری، فلسفیانہ اور مذہبی چیلنجز کا سامنا انہی کے علمی و عقلی اُسلوب میں کرتے تھے۔ انھوں نے یونانی فلسفے، الحادی افکار اور مختلف فکری تحریکوں کا مدلل اور فلسفیانہ انداز میں جواب دیا، جس کے نتیجے میں اسلامی تہذیب میں علمِ کلام، فلسفہ، فقہ اور دیگر علوم

نے غیر معمولی ترقی کی۔ تاہم بعد کے ادوار میں مختلف سیاسی، سماجی اور فکری عوامل کے باعث اجتہاد کا یہ تخلیقی عمل کمزور پڑتا گیا اور مسلم دنیا تدریجاً فکری جمود اور تقلید کی کیفیت کا شکار ہو گئی۔ اسی تناظر میں علامہ اقبالؒ کے خطبات کو جدید اسلامی لٹریچر میں ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ انہوں نے اس علمی روایت کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش کی جس کے ذریعے عہدِ زریں کے عظیم مسلم مفکرین نے مذہب مخالف فلسفیانہ اعتراضات کا جواب فلسفے، منطق اور عقلی استدلال کی بنیاد پر دیا تھا۔ اقبالؒ کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے جدید مغربی فلسفے، سائنس اور تہذیب کا گہرا مطالعہ کر کے اسلامی فکر کو نئے فکری تناظر میں پیش کیا اور یہ واضح کیا کہ اسلام جدید دور کے فکری، سائنسی اور سماجی مسائل کا جواب دینے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔

بالخصوص نو آبادیاتی دور میں جب مغربی استعمار کے ساتھ مغربی فلسفہ، مادیت، الحاد، سائنسی فکر اور سیکولر نظریات نے مسلم معاشروں کو نئے فکری چیلنجز سے دوچار کیا تو مسلم دنیا ان اعتراضات اور سوالات کا مؤثر، منظم اور ہمہ گیر جواب دینے میں بڑی حد تک ناکام رہی۔ ایسے ماحول میں علامہ اقبالؒ کی "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" ایک فکری احیائی منصوبے کے طور پر سامنے آئی، جس کا بنیادی مقصد اسلامی عقائد کی عقلی تعبیر، اجتہادی فکر کی تجدید اور اسلام کو جدید علمی و فلسفیانہ مباحث کے تناظر میں از سرِ نو پیش کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خطبات آج بھی اسلامی فکر کی تجدید، فلسفۂ مذہب، علمِ کلام اور اقبالیات کے میدان میں ایک بنیادی اور مستند علمی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

1. تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، سید نذیر، بزم اقبال لاہور، اول ۱۹۵۸ء

2. مذہبی افکار کی تعمیر نو، شریف کنجاہی، بزم اقبال لاہور، اول ۱۹۹۲ء

3. تفکیر دینی پر تجدید نظر، ڈاکٹر محمد سمیع الحق ایجوکشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلوی، اول، ۱۹۹۴ء

4. تجدید فکریات اسلام، ڈاکٹر وحید عشرت، اقبال اکادمی پاکستان، اول ۲۰۰۲ء

5. اسلامی فکر کی نئی تشکیل شہزاد احمد، مکتبہ خلیل، لاہور، اول جنوری ۲۰۰۵ء

6. تجدید تفکر اسلامی، پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان، اقبال اکیڈمی، لاہور

1. اقبال کا پہلا خطبہ علم اور مذہبی تجربہ، پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان، اقبال اکیڈمی، لاہور، اول ۲۰۰۸ء

2. اقبال کا دوسرا خطبہ۔ تحقیقی و توضیحی مطالعہ، پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان، مثال پبلشرز، فیصل آباد، اول ۲۰۱۶ء

3. اقبال کا تیسرا خطبہ۔ تحقیقی و توضیحی مطالعہ، پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان، بزم اقبال، اول ۲۰۱۰ء

4. تسہیل خطبات اقبال، ڈاکٹر محمد ریاض و دیگر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، دوم ۱۹۹۷ء

5. تلخیص خطبات اقبال، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، بزم اقبال، اول ۱۹۸۸ء

6. خطبات اقبال (تسہیل و تفہیم)، ڈاکٹر جاوید اقبال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء

7. خطبات اقبال (چند فکری اور تفہیمی مسائل)، محمد شعیب آفریدی، ادارہ فکر جدید، لاہور، اول ۲۰۱۴ء

8. خطبات اقبال پر ایک نظر، مولانا سعید اکبر آبادی، اقبال اکیڈمی، لاہور، دوم ۱۹۸۷ء

9. خطبات اقبال پر ایک نظر، محمد شریف بقا، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، دوم ۱۹۷۸ء

10. خطبات اقبال نئے تناظر میں، محمد سہیل عمر، اقبال اکیڈمی، لاہور، چہارم ۲۰۱۸ء

11. خطبات اقبال میں قرآنی حوالے اور مباحث، مسعود احمد خان، اظہار سنز، لاہور، اول، ۲۰۱۵ء

12. فکر اسلامی کی تشکیل نو، پروفیسر محمد عثمان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء

13. فلسفہ اقبال خطبات کی روشنی میں، سید وحید الدین، نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹ء

14. مباحث خطبات اقبال، پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف خان، جہلم بک کارنر، اول ۲۰۱۹ء

15. معارف خطبات اقبال، پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان، نشریات، ۴۰ اردو بازار، لاہور، دوم ۲۰۱۴ء

علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے خطبات ایسے عہد میں مرتب کیے جب دنیا ایک عظیم فکری اور سائنسی تبدیلی کے دور سے گزر رہی تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں جدید سائنس کی حیرت انگیز ترقی، ارتقائی نظریات، طبیعیات کی نئی دریافتوں اور مغربی فلسفے کے فروغ نے مذہب، وحی اور خدا کے وجود سے متعلق نئے سوالات کو جنم دیا۔ یورپ میں سائنسی کامیابیوں کے زیرِ اثر مادیت(Materialism) ، الحاد(Atheism) ، تجربیت (Empiricism)اور اثباتیت (Positivism) جیسے فکری رجحانات نے مذہبی تصورات کو چیلنج کرنا شروع کیا، حتیٰ کہ

بعض مفکرین نے سائنس کو مذہب کا متبادل قرار دینے کی کوشش کی۔ بد قسمتی سے مسلم دنیا، جو اس وقت نو آبادیاتی تسلط، سیاسی زوال اور علمی انحطاط کا شکار تھی، ان نئے فکری چیلنجز کا مؤثر، منظم اور علمی جواب دینے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

علامہ اقبالؒ نے اس بدلتی ہوئی فِکری فضا کا نہایت گہرا اَدراک کیا۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ آنے والے دور میں مذہب اور سائنس کے درمیان تعلق، تصادم اور ہم آہنگی کی بحث عالمی سطح پر علمی مکالمے کا بنیادی موضوع بننے والی ہے۔ اسی لیے انہوں نے ”تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ“ کے ذریعے صرف اسلامی عقائد کی تشریح ہی نہیں کی بل کہ ایک ایسی فکری تحریک کی بنیاد رکھی جس کا مقصد اسلام کو جدید فلسفے اور سائنس کے تناظر میں عقلی اور استدلالی انداز میں پیش کرنا تھا۔ اقبالؒ کے نزدیک جدید ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے محض روایتی مذہبی استدلال کافی نہیں تھا، بل کہ مذہبی تعلیمات کو جدید سائنسی حقائق، فلسفیانہ مباحث اور انسانی تجربات کی روشنی میں سمجھنا اور ان کی نئی تعبیر پیش کرنا وقت کی اہم ضرورت تھی۔ ان کا یقین تھا کہ صحیح معنوں میں سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے مخالف نہیں بل کہ دونوں حقیقت کی جستجو کے مختلف مگر باہم مربوط ذرائع ہیں۔

انسانی فطرت کا بنیادی وصف حقیقت کی جستجو اور علم کی مسلسل تلاش ہے۔ انسان نے اپنے شعور کے ابتدائی مراحل ہی سے کائنات، حیات، انسان، شعور، زمان و مکاں اور مابعد الطبیعی حقائق کے متعلق سوالات اٹھائے ہیں اور ہر دور میں اپنے عہد کے علمی ذرائع کے مطابق ان کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی تجسس انسانی تہذیب، تمدن اور علوم کی ترقی کا بنیادی محرک رہا ہے۔ تاہم عصرِ حاضر میں علوم کی غیر معمولی وسعت، تخصص اور مسلسل ارتقا نے یہ تقریباً ناممکن بنا دیا ہے کہ کوئی ایک فرد تمام علوم پر یکساں دسترس اور مہارت حاصل کر سکے۔ اس کے باوجود ایک باشعور انسان مختلف علمی شعبوں کے بنیادی تصورات، نظریات اور نتائج سے آگاہ رہنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اپنے وجود، اپنے معاشرے اور اپنے گردوپیش کی دنیا کو بہتر انداز میں سمجھ سکے۔

بیسویں اور اکیسویں صدی میں سائنسی علوم کی بے مثال ترقی نے انسانی زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ اطلاعاتی ٹیکنالوجی، مصنوعی ذہانت(Artificial Intelligence) ، جینیاتی انجینئرنگ (Genetic Engineering)، ڈی این اے کی ترتیب(DNA Sequencing) ، خلائی تحقیق، کوانٹم طبیعیات، نینو ٹیکنالوجی، حیاتیاتی علوم، ہولو لینز(HoloLens) ، اسمارٹ آلات اور کائنات کی ابتدا سے متعلق جدید نظریات، خصوصاً نظریۂ عظیم دھماکہ(Big Bang Theory) ، نے نہ صرف انسان کے طرزِ زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا ہے بل کہ اس کے تصورِ کائنات، تصورِ انسان اور تصورِ حقیقت کو بھی نئی جہتیں عطا کی ہیں۔ ان سائنسی کامیابیوں نے جدید تہذیب کی فکری تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا ہے، یہاں تک کہ سائنس آج کے انسان کے لیے علم اور حقیقت تک رسائی کا سب سے مؤثر ذریعہ تصور کی جانے لگی ہے۔

سائنسی ترقی کے اس دور میں سائنس دانوں کی علمی، فکری اور سماجی حیثیت بھی غیر معمولی طور پر مستحکم ہوئی ہے۔ عام انسان، جو سائنسی علوم کی باریکیوں اور تحقیقی حدود سے مکمل واقف نہیں ہوتا، اکثر سائنس دانوں کی شخصی آرا اور فلسفیانہ تعبیرات کو بھی سائنسی حقائق سمجھنے لگتا ہے۔ نتیجتاً ایسے موضوعات، جن کا تعلق خدا کے وجود، مذہب، روح، شعور، اخلاق، مقصدِ حیات اور مابعد الطبیعات سے ہے اور جو سائنسی طریقۂ تحقیق کے دائرۂ کار سے باہر ہیں، ان کے بارے میں بعض سائنس دانوں کے ذاتی نظریات بھی عوامی سطح پر "سائنس کے موقف" کے طور پر قبول کر لیے جاتے ہیں۔ حالاں کہ فلسفۂ سائنس کے مُسلمہ اصولوں کے مطابق سائنس صرف اُن مظاہر کے مطالعے تک محدود ہے جو مشاہدہ، تجربہ، پیمائش اور تکرار کے ذریعے قابلِ تحقیق ہوں، جب کہ خدا، وحی، روح، آخرت، اخلاقی اقدار اور انسانی غایت جیسے مسائل بنیادی طور پر فلسفہ، الٰہیات اور مابعد الطبیعات کے مباحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے ان موضوعات پر سائنس دان کی رائے، بطورِ سائنس دان نہیں بل کہ بطورِ فلسفی یا فرد، ایک شخصی تعبیر شمار ہوتی ہے۔

اسی بنیادی نکتے کو علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے خطبات میں نہایت گہرائی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک سائنس ایک نہایت معتبر اور مؤثر ذریعۂ علم ضرور ہے، لیکن وہ حقیقتِ مطلقہ کا واحد سرچشمہ نہیں۔ اقبالؒ کے مطابق انسانی معرفت کے متعدد ذرائع ہیں، جن میں وحی، عقل، وجدان، روحانی تجربہ اور سائنسی مشاہدہ سب اپنی اپنی حدود میں معتبر اور مؤثر ہیں۔ ان ذرائعِ معرفت کے درمیان کوئی حقیقی تضاد نہیں، بل کہ ہر ایک کا اپنا مخصوص دائرۂ کار، اپنا منہج اور اپنی معرفتی حیثیت (Epistemological Status) ہے۔ جب ان تمام ذرائع کو ان کی فطری حدود کے اندر سمجھا جائے تو مذہب اور سائنس کے درمیان تصادم کا تصور خود بخود ختم ہو جاتا ہے اور ان کے مابین ایک تعمیری، تکمیلی اور بامعنی تعلق سامنے آتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی فکری عظمت کا ایک اہم پہلو یہی ہے کہ انھوں نے جدید سائنس کو رد کرنے یا اس سے مرعوب ہونے کے بجائے اسے اسلامی تصورِ علم کے وسیع تر تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک سائنس مظاہرِ فطرت کے مطالعے کا نام ہے، جب کہ مذہب ان مظاہر کے پسِ پردہ موجود غائی حقیقت، مقصد اور معنویت کو آشکار کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سائنس اور مذہب ایک دوسرے کی ضد نہیں بل کہ حقیقت کے ادراک کے دو تکمیلی زاویے ہیں۔ یہی متوازن اور جامع نقطۂ نظر علامہ اقبالؒ کی فکری تجدید کا امتیاز ہے، جس نے جدید اسلامی فکر کو ایک نئی جہت عطا کی اور مذہب و سائنس کے درمیان مثبت، عقلی اور تعمیری مکالمے کی بنیاد فراہم کی۔

"The Reconstruction of Religious Thought in Islam" کے موضوع پر علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے مشہور خطبات جنوری 1929ء میں مسلم ایسوسی ایشن مدراس (Madras Muslim Association) کی دعوت پر مدراس میں پیش کیے۔ ان خطبات کا بنیادی مقصد جدید فکری، فلسفیانہ اور سائنسی چیلنجز کے تناظر میں اسلامی فکر کی از سرِ نو

تعبیر اور تشکیل تھا۔ بعد ازاں یہی خطبات مدراس کے علاوہ حیدر آباد دکن اور علی گڑھ میں بھی پیش کیے گئے، جہاں انھیں علمی و فکری حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ ان خطبات نے برصغیر کے اہلِ علم، دانش وروں اور محققین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی اور جلد ہی جدید اسلامی فکر کی تشکیل کے حوالے سے ایک اہم علمی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لی۔ علامہ محمد اقبالؒ اپنی سیاسی، تعلیمی اور ادبی مصروفیات کے باوجود ان خطبات پر مسلسل نظرِ ثانی اور ترمیم و اضافہ کرتے رہے تاکہ انہیں کتابی صورت میں زیادہ منظم اور جامع انداز میں پیش کیا جا سکے۔

> "بالآخر 1930ء میں یہ خطبات پہلی مرتبہ لاہور سے "Six Lectures on the Reconstruction of Religious Thought in Islam" کے عنوان سے شائع ہوئے، جن میں چھ خطبات شامل تھے۔ بعد میں اس کتاب کے نئے ایڈیشن میں ساتواں خطبہ "Is Religion Possible?" بھی شامل کیا گیا، جس کے بعد یہ تصنیف اپنی مکمل صورت میں منظرِ عام پر آئی۔ آج "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" اسلامی فلسفۂ مذہب، جدید علمِ کلام اور اقبالیات کی بنیادی اور مستند تصانیف میں شمار کی جاتی ہے اور اسلامی فکر کی تجدید کے سلسلے میں اسے ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔"(۱)

علامہ اقبالؒ کے یہ خطبات محض چند علمی لیکچرز کا مجموعہ نہیں بل کہ جدید اسلامی فکر کی تشکیلِ نو کا ایک جامع فکری منصوبہ ہیں۔ ان میں اقبالؒ نے اسلام کو ایک زندہ، متحرک اور ارتقا پذیر دین کے طور پر پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلامی تعلیمات ہر دور کے فکری، سائنسی اور تہذیبی چیلنجز کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے جدید مغربی فلسفے، سائنس اور تہذیب کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ اسلام عقل، تجربے اور مشاہدے کی نفی نہیں کرتا بل کہ انہیں وحی کے ساتھ ہم آہنگ کر کے ایک جامع تصورِ علم پیش کرتا ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک اجتہاد اسلامی تہذیب کی زندگی اور ارتقا کا بنیادی اصول ہے، جس کے بغیر مسلم معاشرہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا مؤثر جواب نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" آج بھی نہ صرف اقبالیات بل کہ جدید اسلامی فلسفہ، علمِ کلام اور فلسفۂ مذہب کے میدان میں ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے اور مسلم دنیا میں فکری احیا، اجتہادی شعور اور مذہب و سائنس کے باہمی تعلق کے حوالے سے ایک مستند اور قابلِ اعتماد علمی دستاویز سمجھی جاتی ہے۔

"عِلمی حلقوں میں خُطبات کا خاصا چرچا ہوا۔ اگست ۱۹۳۲ء کے تیسرے ہفتے میں انگلستان کی ارسطاطالین سوسائٹی کی درخواست پر ستمبر ۱۹۳۲ء میں پڑھا گیا۔ خطبہ بعنوان Is Religon Possible?۔ اس طرح سات خطبات پر مشتمل یہ کتاب بعنوان The Reconstruction of Religious thought in Islam لندن سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی"۔ (۲)

''تشکیل جدید الہٰیّات اسلامیہ'' کے مقدمہ میں سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:

''"تشکیل جدید الہٰیّات اسلامیہ" کا عُنوان بھی علامہ محمد اقبال کا ہی تجویز کردہ ہے۔ بات یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۲۹ء میں جب اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور باتوں باتوں میں خطبات کے اُردو ترجمے کا ذکر آیا تو ارشاد ہوا کیا مضائقہ ہے؟ ترجمہ ہو جائے تو غیر انگریزی دان ارباب بھی ان کا مُطالعہ کر سکیں گے اور یہ امر شاید فائدے کا موجب ہو"۔ (۳)

سید نذیر نیازی کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ خود بھی اس امر کے خواہاں تھے کہ ان کے خطبات محض انگریزی خواں طبقے تک محدود نہ رہیں بل کہ اردو زبان کے قارئین بھی ان سے استفادہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف اردو ترجمے کی حوصلہ افزائی کی بل کہ اس کے عنوان "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کو بھی خود تجویز فرمایا، جو ان کے فکری منشا اور کتاب کے مرکزی موضوع کی نہایت جامع ترجمانی کرتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ اقبالؒ اپنی فکر کو وسیع تر مسلم معاشرے تک منتقل کرنے کے خواہاں تھے تاکہ جدید دور میں اسلام کے متعلق پیدا ہونے والے فکری، فلسفیانہ اور سائنسی سوالات کا جواب زیادہ سے زیادہ اہلِ علم اور عام تعلیم یافتہ طبقے تک پہنچ سکے۔ چناں چہ "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" صرف ایک فلسفیانہ تصنیف نہیں بلکہ مسلم معاشرے میں فکری بیداری، اجتہادی شعور اور دینی فکر کی تجدید کا ایک مؤثر علمی منشور بھی ہے، جس کی افادیت آج بھی اسی طرح برقرار ہے جیسے اس کی اشاعت کے وقت تھی۔

"تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کا دیباچہ خود علامہ محمد اقبالؒ نے تحریر کیا، جو ان کے فکری شعور، فلسفیانہ بصیرت اور تجدیدی فکر کا جامع مظہر ہے۔ اگرچہ یہ حجم کے اعتبار سے مختصر ہے، تاہم اپنے مضامین، استدلال اور فکری گہرائی کے لحاظ سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس دیباچے میں اقبالؒ نے اپنے خطبات کے بنیادی مقاصد، اسلامی فکر کی تجدید کی ضرورت، جدید فلسفے اور سائنس سے پیدا ہونے والے فکری مسائل، اجتہاد کی اہمیت، مذہب اور عقل کے باہمی تعلق، اور اسلامی الٰہیات کی از سرِ نو تشکیل جیسے بنیادی مباحث کو نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ در حقیقت یہ

دیباچہ پورے مجموعۂ خطبات کا فکری خلاصہ اور تمہیدی منشور ہے، جس میں بعد کے تمام خطبات کے اہم موضوعات اجمالی صورت میں سمٹ آئے ہیں۔ اسی بنا پر "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کے دیباچے کا مطالعہ اقبال کے فکری منہج، ان کے فلسفۂ تجدید اور جدید اسلامی الٰہیات کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے کے لیے ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔ ذیل میں اس دیباچے کے چند اہم نکات کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کے دیباچہ میں علامہ محمد اقبال نے اپنی اس تصنیف کے مقاصد، فکری منہج اور مسلم معاشرے کو درپیش علمی و فکری مسائل کا نہایت جامع انداز میں تعارف کرایا ہے۔ یہ دیباچہ محض مقدمہ نہیں بل کہ اقبال کے پورے فکری منصوبے کا خلاصہ ہے۔ اس میں درج ذیل اہم نکات نمایاں ہیں:

ا۔ قرآن مجید کا فِکر کے بجائے عمل پر زور: علامہ محمد اقبالؒ اپنے دیباچے میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ قرآنِ مجید اگرچہ انسان کو غور و فکر، تدبر اور تعقل کی مسلسل دعوت دیتا ہے، تاہم اس کا اصل مقصود محض نظریاتی بحث یا تجریدی فلسفہ نہیں بل کہ ایسی فکر پیدا کرنا ہے جو عمل میں ڈھل کر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مثبت تبدیلی کا ذریعہ بنے۔ اقبالؒ کے نزدیک قرآن انسان کو ایک فعال، متحرک اور باعمل شخصیت کی تعمیر کا درس دیتا ہے۔ اس لیے قرآن کی نظر میں علم اور فکر کی حقیقی قدر اس وقت ہے جب وہ انسان کے کردار، اخلاق، معاشرت اور اجتماعی نظام میں اصلاح و تعمیر کا سبب بنے۔

اقبالؒ دیباچہ میں اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ قرآنِ مجید انسان کو مسلسل غور و فکر، تدبر، تعقل اور مشاہدہ کی دعوت دیتا ہے، لیکن اس کا مقصد محض نظری فلسفہ نہیں بل کہ ایسا فکر پیدا کرنا ہے جو عمل میں تبدیل ہو۔ اقبالؒ کے نزدیک قرآن کا اسلوب عملی ہے، نظری نہیں۔ قرآن انسانی عقل کو آزاد کرتا ہے، اسے کائنات کے اسرار دریافت کرنے کی دعوت دیتا ہے اور انسان کو فعال کردار ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہی تصور بعد میں اقبالؒ کے فلسفۂ عمل، خودی اور اجتہاد کی بنیاد بنتا ہے۔

اقبالؒ کے مطابق اسلامی تعلیمات میں فکر اور عمل ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ فکر، عمل کی رہنمائی کرتی ہے اور عمل، فکر کی صداقت کو ثابت کرتا ہے۔ اگر فکر عمل سے محروم ہو جائے تو وہ محض ذہنی مشق اور بے روح فلسفہ بن کر رہ جاتی ہے، جبکہ عمل اگر صحیح فکر سے خالی ہو تو وہ مقصدیت اور توازن سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآنِ مجید ایمان کو ہمیشہ "عملِ صالح" کے ساتھ جوڑتا ہے اور انسان کو مسلسل جدوجہد، تخلیقی سرگرمی اور تعمیرِ حیات کی دعوت دیتا ہے۔

علامہ اقبالؒ اسی قرآنی تصور کو بنیاد بنا کر اس امر پر زور دیتے ہیں کہ اسلام رہبانیت، جمود اور محض نظریاتی موشگافیوں کا مذہب نہیں بلکہ حرکت، تخلیق، اجتہاد اور مسلسل عمل کا دین ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کی ایک بڑی وجہ

یہ تھی کہ انہوں نے قرآن کے اس عملی پیغام کو پس پشت ڈال کر دین کو صرف رسمی عبادات اور فلسفیانہ مباحث تک محدود کر دیا، جب کہ قرآن کا اصل مطالبہ یہ ہے کہ انسان فکر و تدبر کے ذریعے حقیقت کو سمجھے اور پھر اس شعور کو عمل، کردار اور اجتماعی زندگی میں نافذ کرے۔ یہی وہ قرآنی منہج ہے جسے اقبالؒ جدید اسلامی فکر کی تشکیلِ نو کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

علامہ مرحوم و مغفور نے اس کتاب "تشکیل جدید الہیّات اسلامیہ" کے مختصر دیباچہ میں سب سے پہلے قرآنی نُقطہ نظر سے عقیدہ و عمل کی اہمیّت، تصوف اور مذہبی تجربات کی افادیت کو بیان کیا ہے۔ بعد ازاں انھوں نے خُطبات کے حقیقی مقصدِ تصنیف، مذہب و سائنس کی بے جا چپقلش اور فلسفہ کی عدم قطعیت پر روشنی ڈالی ہے۔ چناں چہ اب اس دیباچہ کا آغاز جس جملے سے ہوتا ہے وہی دراصل تمام خطبات اقبال کی روح ہے یعنی

> "قرآن مجید وہ کتاب ہے جو تصوّر اور عقیدے سے زیادہ عمل پر زیادہ زور دیتی ہے۔"(۴)

علامہ محمد اقبالؒ کے اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید انسانی شخصیت کی تعمیر میں فکر اور عمل دونوں کو اہمیت دیتا ہے، تاہم اس کی بنیادی توجہ عمل پر مرکوز ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک قرآن کا مقصد محض فلسفیانہ موشگافیوں یا نظریاتی مباحث کو فروغ دینا نہیں، بلکہ ایسی فکر پیدا کرنا ہے جو انسان کے کردار، اخلاق اور اجتماعی زندگی میں مثبت تبدیلی کا باعث بنے۔ چوں کہ تمام انسان یکساں درجے کی عقلی اور فلسفیانہ استعداد نہیں رکھتے، اس لیے قرآنِ مجید نے انسانی نفسیات اور معاشرتی حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایسا منہج اختیار کیا ہے جو ہر فرد کے لیے قابلِ عمل ہو۔ قرآن غور و فکر کی ترغیب ضرور دیتا ہے، لیکن اس فکر کی غایت عملِ صالح، اصلاحِ نفس اور فلاحِ انسانیت کو قرار دیتا ہے۔

اقبالؒ کی رائے میں یہی وہ امتیاز ہے جو اسلامی تعلیمات کو محض نظری فلسفوں سے ممتاز کرتا ہے۔ اسلام میں علم اور فکر کی قدر و قیمت اسی وقت ہے جب وہ عملی زندگی میں حرکت، تخلیق، ذمہ داری اور اجتماعی خیر کا ذریعہ بنیں۔ اس لیے قرآنِ مجید بار بار ایمان کے ساتھ عملِ صالح کا ذکر کرتا ہے اور انسان کو کائنات میں ایک فعال، ذمہ دار اور تخلیقی کردار ادا کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اقبالؒ اسی قرآنی تصور کو بنیاد بنا کر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کی حقیقی روح نظری جمود میں نہیں بل کہ مسلسل عمل، اجتہاد اور تعمیرِ حیات میں مضمر ہے۔ یہی تصور ان کے فلسفۂ خودی اور ان کی فکرِ تجدید کی اساس بھی ہے، جس کے مطابق مسلمان کی زندگی کا اصل مقصد علم کو عمل میں اور عقیدے کو کردار میں تبدیل کرنا ہے۔

قرآن فکر سے زیادہ عمل پر زور دیتا ہے۔ اگرچہ قرآن نے غور و فکر کو نظر انداز نہیں کیا اور نہ ہی اس کی مخالفت کرتا ہے۔ لیکن چوں کہ عام آدمی غور و فکر کے عادی نہیں ہوتے اور بعض انسانوں میں صلاحیت پوری طرح بیدار بھی نہیں ہوتی، اس

لیے اس نفسیاتی نقطہ نظر کو قرآن نے پیش نظر رکھا ہے تاکہ انسانی شخصیت کے اس میدان کو کام میں لایا جائے جو فرد اور جماعت دونوں میں مشترک ہو اور جس سے مفید کام سر انجام دیئے جا سکیں۔

> "علامہ محمد اقبالؒ کے نزدیک ہر انسان اس درجے کی باطنی اور فلسفیانہ بصیرت کا حامل نہیں ہوتا کہ وہ اپنی داخلی کیفیات کا گہرا تجزیہ کر سکے۔ اسی لیے قرآنِ مجید نے عام انسان کی فطرت اور نفسیاتی استعداد کو مد نظر رکھتے ہوئے عمل کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ اقبالؒ کے مطابق عملی زندگی ہی وہ میدان ہے جہاں ہر فرد اپنی استعداد کے مطابق انفرادی و اجتماعی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے ایمان کو مضبوط اور معاشرے کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے"۔(۵)

علامہ محمد اقبالؒ کے اس تصور سے یہ حقیقت بھی نمایاں ہوتی ہے کہ اسلام انسانی زندگی کو محض انفرادی روحانی تجربات تک محدود نہیں کرتا بل کہ اسے ایک فعال اور متحرک اجتماعی نظامِ حیات کے طور پر پیش کرتا ہے۔ قرآنِ مجید کا مطلوب انسان وہ ہے جو اپنے ایمان کا اظہار صرف عقائد یا احساسات تک محدود نہ رکھے بل کہ اپنے کردار، اخلاق، معاشرت اور اجتماعی ذمہ داریوں کے ذریعے اسے عملی شکل دے۔ اقبالؒ کے نزدیک عمل ہی وہ کسوٹی ہے جس پر ایمان کی صداقت اور انسانی شخصیت کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی پوری فکری کاوش میں مسلمانوں کو جمود، تقلید اور بے عملی سے نکل کر حرکت، اجتہاد اور تعمیری عمل کی دعوت دی، کیونکہ ان کے نزدیک فرد اور قوم کی ترقی کا راز فکر اور عمل کے حسین امتزاج میں پوشیدہ ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ کے نزدیک قرآنِ مجید کائنات کو ایک بامقصد، منظم اور حکیمانہ تخلیق قرار دیتا ہے۔ قرآن کے مطابق یہ کائنات محض اتفاق، کھیل یا بے مقصد عمل کا نتیجہ نہیں بل کہ ایک عظیم حکمت اور واضح غایت کے تحت وجود میں آئی ہے۔ اگرچہ بعض فلسفی اور مفکر کائنات کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے خالق کے وجود سے انکار کرتے ہیں، جب کہ بعض دیگر کائنات کی تخلیق کو مانتے ہوئے دنیا میں موجود شر، تکلیف اور مصائب کو بنیاد بنا کر خدا کی حکمت پر سوال اٹھاتے ہیں۔ اس کے برعکس قرآنِ مجید یہ واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت، مصلحت اور مقصد سے خالی نہیں ہوتا۔ چناں چہ کائنات کی تخلیق بھی ایک عظیم مقصد کے تحت عمل میں آئی ہے، جس میں انسان کو امتحان، اخلاقی ارتقا اور اپنے خالق کی معرفت کے مواقع فراہم کیے گئے ہیں۔ اقبالؒ اسی قرآنی تصور کو بنیاد بنا کر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کائنات ایک زندہ، متحرک اور بامقصد نظام ہے، جس کا مطالعہ انسان کو خالقِ کائنات کی حکمت، قدرت اور ربوبیت کے ادراک تک پہنچاتا ہے۔ علامہ اقبال "علم اور مذہبی مشاہدات" میں قرآن کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:۔

"کائنات کی آفرنیش محض دل لگی کا نتیجہ نہیں بل کہ مبنی بر حقیقت ہے۔ بعض اہل فکر و دانش کائنات کے وجود کے تو قائل ہیں مگر وہ اس کے خالق کی ہستی پر یقین نہیں رکھتے۔ حکماء کا دوسرا گروہ کائنات کی تخلیق کو بر حق ماننے کے ساتھ ساتھ ہر جگہ شر اور غم کو عیاں دیکھتا ہے۔ قرآن حکیم کا دعویٰ ہے کہ خدا کا کوئی فعل بھی حکمت بالغہ اور مقصدیت سے خالی نہیں ہوتا اس لیے اس کائنات کی پیدائش کی بھی خاص غرض وغایت ہے''۔

ارشادِ ربانی ہے۔ ترجمہ: اے خدا! تُو نے اسے بے کار پیدا نہیں کیا۔

"کیا یہ ہماری حماقت نہیں کہ ہم اپنے کاموں کو تو با مقصد سمجھیں اور خدا کے کاموں کو عبث کریں''۔[۲]

علامہ محمد اقبالؒ نے اپنی شاعری اور نثر دونوں میں قرآنِ حکیم کی آفاقی، حیات آفریں اور انقلابی تعلیمات کو اپنے منفرد فکری اور فلسفیانہ اسلوب میں اجاگر کیا ہے۔ ان کے نزدیک قرآنِ مجید محض عبادات یا چند مذہبی احکام کی کتاب نہیں بل کہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو انسان کی انفرادی، اجتماعی، اخلاقی، روحانی، فکری، سیاسی اور تمدنی زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اسی لیے اقبالؒ نے اپنی فکری کاوشوں میں قرآن کو بنیادی ماخذِ علم و ہدایت قرار دیتے ہوئے اس کے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا جو جدید انسان کو فکری اضطراب، روحانی بحران اور تہذیبی انتشار سے نجات دلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن کا ہر حکم حکمت، مقصدیت اور انسان کی فلاح پر مبنی ہے، لہٰذا وہ انسانی زندگی کے کسی بھی اہم شعبے کو نظر انداز نہیں کرتا بل کہ ہر دور کے انسان کے لیے رہنمائی کا کامل سرچشمہ ہے۔

۲۔ وارداتِ باطن (مذہبی مشاہدہ) ہر آدمی کے بس کا کام نہیں: علامہ محمد اقبالؒ کے نزدیک مذہبی تجربہ یا وارداتِ باطن انسانی معرفت کا ایک نہایت بلند اور لطیف درجہ ہے، جو محض عقلی استدلال یا حسی مشاہدے سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسا باطنی شعور ہے جو روحانی ریاضت، تزکیۂ نفس، ایمانِ کامل اور مسلسل مجاہدۂ نفس کے نتیجے میں انسان کو عطا ہوتا ہے۔ اقبالؒ کے مطابق ہر انسان اس مقام تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا، کیوں کہ اس کے لیے محض علمی استعداد کافی نہیں بل کہ باطنی پاکیزگی، روحانی بالیدگی اور قلبی بصیرت بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید اگرچہ انسان کو تدبر، تفکر اور معرفت کی دعوت دیتا ہے، لیکن ساتھ ہی تزکیۂ نفس، عملِ صالح اور قربِ الٰہی کو اس معرفت کے حصول کا لازمی ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اقبالؒ اسی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے وارداتِ باطن کو انسان کی اعلیٰ ترین روحانی صلاحیت قرار دیتے ہیں، جس کے ذریعے وہ اپنے نفس کی حقیقت کو پہچاننے کے ساتھ ساتھ کائنات کے باطنی نظام اور اس کے خالق کی معرفت سے بھی آشنا ہوتا ہے۔

"کائنات بظاہر ہمارے مدمقابل غیر اور بیگانہ سی لگتی ہے، لیکن حضرت علامہ کے نزدیک کائنات کی حقیقت، کیفیت اور حرکت(عمل)کی ہے۔عام احساس کے ذریعے ہم اسے اپنا غیر ہی دیکھیں گے، لیکن اگر انسان اپنے نفس کی حقیقی کیفیتیوں تک جا پہنچے تو اس کے نفس کی کیفیتوں اور کائنات کی کیفیت میں یکسانی محسوس ہوگی۔اس طرح انسان کا یہ نفس جس نے اپنے عمق میں جاکر کیفیتوں کو بیدار کرکے ان پر اپنی گرفت مضبوط کرلی ہو، وہ اپنے ماحول کو بھی اپنے اندر جذب کرسکتاہے"۔(۷)

۳۔ دورِ حاضر کا اِنسان محسوسات کا خُوگر: موجودہ دور کے انسان نے اپنے فکر کا دائرہ کار محسوسات کے گرد کھینچ رکھاہے اور وہ کائنات کی جملہ اشیا اور اس میں رونما ہونے والے واقعات سے ہی اپنی فکر کو آگے بڑھاتاہے یعنی اس کے اس فکر کی انتہا انہیں اشیاو واقعات کے گرد گھومتی ہے۔غور وفکر کا یہ میدان عملاً پُختہ ہوچکاہے۔اس سے ہم یہ اُمید نہیں کرسکتے کہ وہ اشیاء و واقعات سے ہٹ کر فکر کا کوئی اور راستہ بنائے اور حقیقت تک پہنچے یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اشیاو حادثات کے حوالے سے ہی فکر کی نشوونما کے لیے اِسلام کے ابتدائی زمانے میں عمل ہواہے۔

"یہ زمانہ اس کے تہذیب و تمدن کی ترقی اور ارتقا کا دور تھا جو بعد کے ادوار کے لیے بنیاد بنا۔بدیں درجہ فِکر کی اس نہج کو خالصتاً اسلامی سمجھ لیا گیاہے جس کے نتیجے میں اور عدم مشق کی بناء پر وہ (مسلمان)اور بھی اس کا اہل نہیں رہا کہ اپنی وارداتِ باطن کو دیکھ سکے بلکہ مزاج کی اس طرح کی روش سے اپنی اور دوسروں کی واردات باطن کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا ہے۔پھر باطنی کیفیات وہم التباس سے پاک نہیں ہوتیں جن سے بعض مسلمہ صداقتوں کا بطلان ہونے لگتاہے، ان کا مبنی پر صداقت ہونا مزید مشکوک ہوجاتاہے"۔(۸)

"رہا عہد حاضر کا اِنسان سواُسے محسوس یعنی اس قسم کے فکر کی عادت ہوگئی ہے جس کا تعلق اشیاء اور حوادث کی دنیا سے ہے اور یہ وہ عادت ہے جس کی اسلام میں اور نہیں تو اپنے تہذیبی نشوونما کے ابتدائی ادوار میں حمایت کی،

لہٰذا وہ ان واردات کا اور بھی اہل نہیں رہا، بلکہ اُنھیں شک و شبے کی نظر سے
دیکھتا ہے۔ کیوں کہ ان میں وہم التباس کی پوری پوری گنجائش ہے"۔[۹]

۴۔ مذہبی واردات میں شک وشُبہ کی گنجائش: علامہ محمد اقبالؒ کے نزدیک مذہبی تجربہ (Religious Experience) انسانی معرفت کا ایک مستند ذریعہ ہے، لیکن جدید دور کے انسان کے لیے اس کی صداقت کو قبول کرنا آسان نہیں رہا۔ جدید سائنسی اور مادی فکر نے انسان کو محسوسات اور تجرباتِ حسی تک محدود کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں وہ ان حقائق کو، جو باطنی شعور، روحانی تجربے اور وجدانی ادراک سے متعلق ہیں، شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگا ہے۔ اقبالؒ اس رجحان کو جدید ذہن کی ایک فکری کمزوری قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگرچہ اسلام نے مشاہدۂ کائنات، عقل اور تجربے کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ انسانی شعور کی ان داخلی صلاحیتوں کو بھی تسلیم کرتا ہے جن کے ذریعے انسان حقیقتِ مطلقہ سے ایک زندہ تعلق قائم کر سکتا ہے۔ اسی تناظر میں اقبالؒ مذہبی واردات کو محض جذباتی کیفیت نہیں بلکہ ایک حقیقی اور معتبر روحانی تجربہ قرار دیتے ہیں، اگرچہ جدید انسان اس کی صحت اور حجیت کے بارے میں مختلف شکوک وشبہات کا اظہار کرتا ہے۔ علامہ اقبال نے دیباچے میں اس امر کی وضاحت کر دی ہے

"آج کا انسان جہان آب و گِل سے تعلق رکھنے والی سوچ کا عادی ہو گیا ہے
اور ہر چند اس عادت کی اسلام نے اپنی ثقافتی سفر کی پہلی منازل میں خود ہی
حوصلہ افزائی کی تھی لیکن اسی کے باعث داخلی واردات اس کے بس کی بات
نہیں رہی اور اب اسے وہ شک کی نظروں سے دیکھنے لگا ہے اور اس میں
التباس کی رخنہ اندازی کو ممکن جانتا ہے"۔[۱۰]

۵۔ اِبتدائے اِسلام میں تصوف کا مُثبت کردار: علامہ محمد اقبالؒ تصوف کے بنیادی مقاصد اور اس کی حقیقی روح کے معترف ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی تصوف کے مستند اور خالص مکاتبِ فکر نے انسان کی روحانی تربیت، تزکیۂ نفس اور مذہبی واردات کی تشکیل و ارتقا میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان مکاتب نے انسان کے باطن کو جِلا بخشنے، قربِ الٰہی کے شعور کو مضبوط کرنے اور روحانی تجربات کو ایک منظم صورت دینے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ تاہم اقبالؒ اس امر پر بھی زور دیتے ہیں کہ تصوف ایک زندہ اور متحرک روایت ہے، جسے ہر دور کے فکری، علمی اور تہذیبی تقاضوں کے مطابق آگے بڑھنا چاہیے۔ اگر تصوف اپنے ماضی کے تجربات تک محدود ہو جائے اور جدید ذہن، نئے علمی مباحث اور بدلتے ہوئے معاشرتی حالات سے کوئی ربط قائم نہ کرے تو اس کی تخلیقی قوت ماند پڑ جاتی ہے۔ اسی تناظر میں اقبالؒ نے بعد کے صوفیانہ حلقوں پر تنقید کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ ان کی کمزوری تصوف کی اصل تعلیمات میں نہیں بل کہ اس کے نمائندوں کے اس جمود میں ہے جو انہیں عصرِ حاضر کے فکری مسائل سے ہم آہنگ ہونے سے روکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

اقبالؒ مذہبی واردات کی صحت اور افادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی تعبیر و تفہیم کو جدید شعور کے مطابق استوار کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔

اس میں شُبہ نہیں کہ تصوف کے صحیح مکاتب نے اسلام میں مذہبی تجربے کے ارتقاء کی سمت کو درست کرنے اور اس کی صورت گری کے سلسلے میں نمایاں کام کیا ہے مگر ان مکاتب کے بعد کے دور کے نمائندے جدید ذہن سے لاعلم ہونے کی بناپر اس قابل نہیں رہے کہ نئے فکر اور تجربے سے کسی قسم کی تازہ تخلیقی تحریک پاسکیں-وہ انہیں طریقوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں جو ان لوگوں کے لئے وضع کئے گئے تھے جن کا ثقافتی نقطہ نظر کئی اہم لحاظ سے ہمارے نقطہ نظر سے مختلف تھا- دیباچہ بے حد فکر انگیز ہے جس میں اقبال نے کھل کر کہا کہ

> " صحیح قسم کے سلسلہ ہائے تصوف نے تو بے شک ہم مسلمانوں میں مذہبی احوال و واردات کی تشکیل اور رہنمائی میں بڑی قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں، لیکن آگے چل کر ان کی نمائندگی جن حضرات کے حصے میں آئی، وہ عصر حاضر کے ذہن سے بالکل فائدہ نہ اٹھا سکے وہ آج بھی انہی طریقوں سے کام لے رہے ہیں جو ان لوگوں کے لیے وضع کئے گئے تھے جن کا تہذیبی مطمع نظر سے بڑا مختلف تھا"۔(۱۱)

> "تصوف کے جو زیادہ کھرے مکاتب فکر ہیں بلاشبہ انھوں نے مذہبی واردات کے ارتقا کو صورت دینے اور جہت عطا کرنے کے لیے بہت کچھ کیا ہے"۔(۱۲)

۶۔بعد کے لوگ تصوف کو دورِ جدید سے تعبیر نہ کرسکے:علامہ محمد اقبالؒ کے نزدیک مذہبی واردات اور روحانی تجربات کی حقیقت سے انکار کرنا درست نہیں، بل کہ اصل ضرورت ان کی جدید علمی اور فکری تناظر میں تعبیر و تشریح کی ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلام کی فکری روایت ہمیشہ ارتقا پذیر رہی ہے اور ہر دور میں نئے حالات اور نئے علمی انکشافات کی روشنی میں دینی افکار کی از سرِنو تعبیر کی جاتی رہی ہے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر اقبالؒ نے اسلامی روایات، کلاسیکی فکر اور عصرِ حاضر میں مختلف علوم، خصوصاً فلسفہ اور سائنس، میں ہونے والی ترقیات کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک یہ مطالبہ بالکل بجا ہے کہ مذہب سے حاصل ہونے والے علم کو اس اسلوب اور زبان میں بیان کیا جائے جسے جدید علمی دنیا سمجھ سکے۔ اقبالؒ کو یقین تھا کہ مستقبل میں سائنس اور مذہب کے

درمیان ایسی ہم آہنگیوں کا انکشاف ہو گا جو اس وقت انسانی نگاہ سے اوجھل ہیں، تاہم وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ فلسفیانہ فکر کبھی حتمی نہیں ہوتی، بلکہ علم کے ارتقا کے ساتھ نئی تعبیرات اور بہتر نظریات سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس لیے انسانی فکر کی مسلسل تنقید، نظرِ ثانی اور آزادانہ علمی تحقیق ناگزیر ہے۔

اسی تناظر میں اقبالؒ اس تصور کی بھی تردید کرتے ہیں کہ مذہبی واردات یا روحانی تجربات حقیقت سے عاری یا محض وہم و تخیل ہیں۔ ان کے نزدیک اس قسم کے شکوک کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بعد کے ادوار میں تصوف کے نمائندے اپنے اسلاف کی طرح بدلتے ہوئے زمانے کے فکری، تہذیبی اور علمی تقاضوں سے ہم آہنگ نہ رہ سکے۔ انھوں نے روحانی تجربات کی اصل روح کو برقرار رکھنے کے بجائے قدیم طریقوں کی محض تقلید کو اختیار کیا، جس کے نتیجے میں تصوف کی تخلیقی اور اجتہادی قوت کمزور پڑ گئی۔ حالاں کہ ابتدائی اور مستند سلاسلِ تصوف نے مذہبی واردات کی تشکیل، تزکیۂ نفس اور روحانی تربیت میں بے مثال خدمات انجام دی تھیں۔ ان بزرگوں نے اپنے عہد کے علمی اور تہذیبی شعور سے ہم آہنگ رہتے ہوئے روحانی تجربات کی ایسی تعبیر پیش کی جو معاشرے کی فکری ضروریات سے مطابقت رکھتی تھی۔ اس کے برعکس بعد کے نمائندے قدیم ذرائع اور طریقۂ کار تک محدود رہے، جو جدید تہذیبی اور فکری ماحول کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ تھے۔ اقبالؒ کے نزدیک اسی جمود نے مذہبی واردات کے بارے میں شکوک و شبہات کو جنم دیا، ورنہ اگر ان روحانی تجربات کی جانچ، تعبیر اور تفہیم کے لیے جدید علمی اصولوں کے مطابق نئے مناہج اختیار کیے جائیں تو وہ آج بھی حقیقتِ مطلقہ کے ادراک اور انسانی معرفت کے ارتقا میں نہایت مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

> "تصوف کے جو زیادہ کھرے مکاتب فکر ہیں بلاشبہ انہوں نے مذہبی واردات کے ارتقا کو صورت دینے اور جہت عطا کرنے کے لیے بہت کچھ کیا ہے، مگر ان کے بعد آنے والے جدید ذہن کے متعلق اپنی لاعلمی کی وجہ سے قطعاً اس قابل نہیں رہے کہ جدید فکر اور تجربے سے زیادہ گہرائی میں جا کر متاثر ہو سکیں"۔ (۱۳)

۷۔ تصوف کے لیے بدنی ریاضت کے بجائے نفسیاتی اعتبار سے قابل قبول طریقہ: علامہ محمد اقبالؒ کی فکری جدوجہد کا ایک بنیادی مقصد تصوف کی اسی حقیقی اور متحرک روایت کو از سرِ نو زندہ کرنا تھا، جو ہر عہد کے علمی، فکری اور تہذیبی تقاضوں کے مطابق اپنی تعبیر اور اسلوب میں تجدید پیدا کرتی ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک تصوف کا حقیقی جوہر جمود، تقلید اور ماضی پرستی نہیں بل کہ مسلسل ارتقا، اجتہاد اور روحانی تخلیق ہے۔ اسی لیے وہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ اگر مذہبی واردات اور روحانی تجربات کو جدید انسان کے لیے مؤثر اور قابلِ قبول بنانا ہے تو ان کی تعبیر جدید نفسیات، جدید فلسفے اور جدید سائنسی علوم کی روشنی میں کی جانی چاہیے۔ ان کے نزدیک صرف اسی صورت میں مذہب جدید ذہن کے سوالات کا اطمینان بخش

جواب دے سکتا ہے اور انسان کے اندر حقیقت کی تلاش، فکری بیداری اور مسلسل جستجو کا جذبہ پیدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ اقبالؒ کی نظر میں اسلامی تصوف کا اصل مقصد انسان کو دنیا سے فرار کی دعوت دینا نہیں بلکہ اسے باطنی استحکام، فکری بالیدگی اور تعمیری عمل کے ذریعے خدا، انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کا شعور عطا کرنا ہے، تاکہ وہ ہر نئے دور میں اپنی روحانی زندگی کو تازہ رکھتے ہوئے علم و عمل کے میدان میں مؤثر کردار ادا کر سکے۔

۸۔ مذہب کو سائنس کی زبان میں سمجھانے کی کوشش: علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے خطبات میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کا جو منصوبہ پیش کیا، اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے مذہبی حقائق کو جدید علمی اور سائنسی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک اسلام ایک آفاقی اور ابدی دین ہے، اس لیے اس کی تعلیمات ہر دور کے علمی اور فکری تقاضوں کے مطابق نئی تعبیر کی متقاضی ہیں۔ اقبالؒ نے اسلامی فکری روایت، قرآن و سنت، علمِ کلام اور فلسفۂ اسلام کے بنیادی اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے جدید فلسفے، نفسیات اور سائنسی علوم میں ہونے والی ترقیات سے استفادہ کیا اور ان کے تناظر میں اسلامی الٰہیات کی از سرِنو تشکیل کی کوشش کی۔

اقبالؒ کے نزدیک مذہب اور سائنس کے درمیان کوئی حقیقی تضاد نہیں، بلکہ یہ دونوں حقیقت کے مختلف پہلوؤں کی جستجو کرتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ قدیم سائنس کی بنیاد مادیت (Materialism) اور جامد تصورِ کائنات پر استوار تھی، لیکن جدید سائنسی تحقیقات، خصوصاً طبیعیات میں ہونے والی نئی دریافتوں نے اس تصور پر بنیادی سوالات اٹھا دیے ہیں۔ اس کے نتیجے میں سائنس خود مادے کی حتمی حیثیت پر نظر ثانی کر رہی ہے اور کائنات کو ایک متحرک، ارتقاپذیر اور پیچیدہ نظام کے طور پر دیکھنے لگی ہے۔ اقبالؒ نے اس فکری تبدیلی کو مذہب اور سائنس کے درمیان قربت کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا اور اس امید کا اظہار کیا کہ مستقبل میں دونوں کے درمیان ایسی ہم آہنگیوں کا انکشاف ہو گا جو اس وقت انسانی علم کی دسترس سے باہر ہیں۔ اس طرح اقبالؒ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام جدید سائنسی شعور سے متصادم نہیں بل کہ اس کے ساتھ ایک مثبت، تعمیری اور بامعنی مکالمہ قائم کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

> " علامہ اقبال کہتے ہیں کہ جب تک کوئی نیا طریقہ دریافت نہیں ہوتا اس وقت تک باطنی واردات سے حاصل شدہ معلومات کو سائنسی طریقے سے سمجھنے کی کوشش کی جائے چوں کہ اس قسم کی رائے حضرت علامہ کی طرف سے ہی پیش کی گئی، لہٰذا اس کی سائنسی توضیح کی ابتدا بھی علامہ اقبال کو خود ہی کرنا پڑی، جو خُطبات کی صورت میں ہمارے سامنے ہے"۔ (۱۴)

دنیا کے کچھ بڑے سائنسدانوں کے ملحد ہونے اور مذہب مخالف ہونے کے باعث اس نظریے کو تقویت ملی ہے کہ سائنس شاید مذہب اور خدا کے وجود سے متصادم ہے–یہ عجیب معاملہ کوئی نیا نہیں ہے بل کہ اسے تقویت تب ہی سے ملی ہے جب

سے دنیا کی حکمران قوموں نے مذہب کو ایک محض ذاتی معاملہ قرار دے کر اجتماعی زندگی سے نکالا ہے- تاہم علامہ اقبالؒ نے مذہب اور سائنس کے درمیان موجود مشترک بنیادوں پر بحث کو نئی جہت دے کر اس بحث کی نئی راہ متعین کی ہے- مذہب اور سائنس کے درمیان مشترکہ بنیادیں تلاش کرنے کی بحث کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ سائنس ہر دور میں ارتقاپذیر رہی ہے اور یہ ارتقاء اس کائنات کو سمجھنے کے بنیادی اصولوں کو بھی بعض اوقات تبدیل کر دیتی ہے۔

۹۔ اقبالؒ نے الہٰیات کی تشکیل جدید جدید تقاضوں کے مطابق کی ہے: اقبالؒ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلامی فکر کی بنیاد قرآن و سنت اور مسلم فکری روایت پر قائم رہنی چاہیے، تاہم اس کی تعبیر ایسی ہو جو جدید انسان کے ذہنی، فکری اور سائنسی شعور سے ہم آہنگ ہو۔ اسی لیے انھوں نے قدیم اسلامی فلسفے، علمِ کلام اور تصوف کی مثبت روایات کو جدید فلسفے، نفسیات اور سائنس کی نئی تحقیقات کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کی۔

علامہ اقبالؒ دیباچہ میں رقم طراز ہیں:۔

> "میرا مقصد یہ ہے کہ مُسلمانوں کا مذہبی فلسفہ اس انداز میں پیش کیا جائے کہ اسلام کی فلسفیانہ روایات کو ملحوظ خاطر رکھا جائے اور انسانی افکار کے جدید افکار سے بھی ثبوت مہیا کیا جائے۔ قدیم و جدید کے اس امتزاج سے فکر اسلامی ایک نئی شکل اختیار کر سکتا ہے''۔ (۱۵)

علامہ محمد اقبالؒ کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید کا مقصد دین کے بنیادی عقائد یا اصولوں میں تبدیلی لانا نہیں، بلکہ انہیں عصرِ حاضر کے علمی، فلسفیانہ اور سائنسی تناظر میں از سرِ نو پیش کرنا ہے۔۔ ان کے نزدیک اسلام ایک زندہ اور ارتقاپذیر دین ہے، جو ہر دور کے بدلتے ہوئے حالات میں اپنی ابدی تعلیمات کی روشنی میں نئے مسائل کا حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی فکرِ تجدید اقبالؒ کے خطبات کی روح ہے، جس کے ذریعے انہوں نے اسلامی الٰہیات کو جدید ذہن کے لیے زیادہ مؤثر، معقول اور قابلِ فہم بنانے کی سعی کی۔

۱۰۔ جدید انکشافات کی بدولت سے مذہب اور سائنس کی ہم آہنگی: تشکیل جدید الہیات اسلامیہ اپنے دیباچہ میں علامہ اقبالؒ نے قرآن پاک کی ایک ہی آیت مبارکہ تحریر کی ہے۔ حضرت علامہ کا کہنا ہے کہ بنی نوع انسان کا اصل سرچشمہ ایک ہی وحدت ہے اور وہ ہے زندگی کی وحدت۔ اس حقیقت کا استدلال وہ قرآن مجید سے کرتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔

ترجمہ: ''تمہاری تخلیق اور قیامت کے دن دوبارہ اٹھایا جانا ایک نفسِ واحد کی تخلیق وبعثت کی مانند ہے''۔ (۱۶)

اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی نیا طریقہ دریافت کیا جائے تاکہ انسانوں میں ایک برادری کے ہونے کا احساس پیدا ہو، جو ان طریقوں سے بالکل مختلف ہو جن کا تعلق بدنی ریاضت سے تھا کیوں کہ ان پرانے بدنی ریاضت کے طریقوں سے دورِ جدید کا انسان نامانوس ہو سکتا ہے اور نہ ہی انہیں برداشت کر سکتا ہے۔ بدنی ریاضت کے طریقے کے مقابل علامہ اقبال نفسی طریق کو تجویز کرتے ہیں تاکہ جدید ذہن ان باطنی واردات کی طرف مائل ہو سکے اور محسوسات سے مانوس ہونے کے باوجود باطنی احوال کو بھی باآسانی قبول کرنے پر آمادہ ہو۔

علامہ محمد اقبالؒ کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید کا مقصد دین کے بنیادی عقائد یا اصولوں میں تبدیلی لانا نہیں، بل کہ انہیں عصرِ حاضر کے علمی، فلسفیانہ اور سائنسی تناظر میں از سرِ نو پیش کرنا ہے۔ اقبالؒ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلامی فکر کی بنیاد قرآن و سنت اور مسلم فکری روایت پر قائم رہنی چاہیے، تاہم اس کی تعبیر ایسی ہو جو جدید انسان کے ذہنی، فکری اور سائنسی شعور سے ہم آہنگ ہو۔ اسی لیے انھوں نے قدیم اسلامی فلسفے، علمِ کلام اور تصوف کی مثبت روایات کو جدید فلسفے، نفسیات اور سائنس کی نئی تحقیقات کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک اسلام ایک زندہ اور ارتقا پذیر دین ہے، جو ہر دور کے بدلتے ہوئے حالات میں اپنی ابدی تعلیمات کی روشنی میں نئے مسائل کا حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی فکرِ تجدید اقبالؒ کے خطبات کی روح ہے، جس کے ذریعے انھوں نے اسلامی الٰہیات کو جدید ذہن کے لیے زیادہ مؤثر، معقول اور قابلِ فہم بنانے کی سعی کی۔

۱۱۔ علوم میں وحدت کی تلاش: دیباچے میں علامہ دور حاضر کی علمی ترقی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ وقت دور نہیں جب مذہب اور جدید سائنس کی سرحدیں باہم مل جائیں گی۔ تشکیل جدید کے دیباچے میں اس کی وضاحت علامہ نے یوں کی ہے فزکس کے لیے اب خود اپنی ہی بنیادوں پر تنقید ناگزیر ہو گئی ہے جس کی بنا پر اس کے اپنے بنائے ہوئے بت بھی از خُود ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں اور حواسی رویہ جو سائنسی مادیت کی احتیاج کے طور پر ظاہر ہوا تھا اب مادہ کے خلاف ہو گیا ہے۔ اب چوں کہ اشیاء موضوعی حالتیں نہیں جن کا سبب نا قابل ادراک شے یعنی مادہ ہے وہ حقیقی مظاہر ہیں جن سے فطرت کا ہیولیٰ متشکل ہوتا ہے اور جن کو ہم فطرت کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ تاہم ایک اور ممتاز ماہر طبیعیات آئن سٹائن نے تو مادہ کے تصور کے پرخچے اُڑا دیئے ہیں۔

> "اس کی دریافتوں نے انسانی فکر کے پُورے نظام میں ایک دُور رس انقلاب کی بنیادیں فراہم کر دی ہیں"۔ (۱۷)

۱۲۔ اقبالؒ کے بقول خُطبات کے نظریات حتمی نہیں ہیں: علامہ محمد اقبالؒ کے خطبات کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ انہیں کوئی قطعی، حتمی اور ناقابلِ تنقید نظریہ قرار نہیں دیتے، بل کہ ایک مسلسل فکری سفر کا آغاز سمجھتے ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک علم و فکر ایک ارتقائی عمل ہے، جو زمانے کے تغیر، انسانی تجربات اور نئی سائنسی و فلسفیانہ دریافتوں کے ساتھ مسلسل

وسعت اختیار کرتا رہتا ہے۔ اسی لیے وہ اجتہادی فکر کو اسلامی تہذیب کی روح قرار دیتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہر دور کے اہلِ علم کو بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں دینی افکار پر غور و فکر کرتے رہنا چاہیے۔ ان کے نزدیک علمی دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنی آراء کو حرفِ آخر نہ سمجھے بلکہ انہیں مزید تحقیق، تنقید اور اصلاح کے لیے کھلا رکھے۔ اسی احساسِ ذمہ داری اور فکری انکسار کے تحت انہوں نے اپنے خطبات کے اختتام پر نہایت اہم بات ارشاد فرمائی:

> "دیباچہ کے آخر میں حضرت علامہ نے اپنے خطبات کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ایک فکری کاوش ہے جو حرفِ آخر نہیں۔ اور جوں جوں ہمارا علم وسیع ہو تا جائے گا فکر کے لیے نئے نئے راستے دریافت ہوں گے اور ممکن ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو ان خُطبات میں پیش کئے گئے ہیں، ان سے بہتر خیالات و نظریات بہتر طریقے سے پیش کیے جائیں"۔ (۱۸)

۱۳۔ فِکرِ انسانی پر تنقید جاری رہنی چاہیے: جن کی وساطت سے ہم نئے انکشافات سے آشنا ہوں، بہر حال ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اپنی سطح پر دورِ جدید کے تقاضوں کی روشنی میں فکرِ انسانی کی نشوونما میں برابر کے شریک رہیں اور حدِ احتیاط میں رہتے ہوئے نشوونما میں بھرپور حصّہ لیں تاکہ نئے انکشافات پر آزادانہ تحقیق و تنقید کا سلسلہ جاری رہے۔

علامہ اقبالؒ کی فکری عظمت کا ایک اہم پہلو ان کی علمی دیانت، فکری انکساری اور اجتہادی بصیرت ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیف تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کے دیباچے میں یہ واضح کیا کہ ان کی پیش کردہ تعبیرات کو حتمی اور ناقابلِ تغیر نہیں سمجھنا چاہیے، کیونکہ انسانی علم اور فکری شعور مسلسل ارتقاپذیر ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک اسلام ایک زندہ اور متحرک دین ہے، اس لیے اس کی فکری تعبیر بھی ہر دور کے علمی، سائنسی اور فلسفیانہ تقاضوں کی روشنی میں آگے بڑھتی رہنی چاہیے۔ وہ جمودِ فکر کے بجائے تحقیق، تنقید اور اجتہاد کے قائل تھے، اسی لیے انہوں نے اپنی آراء کو مستقبل کے اہلِ علم کے لیے قابلِ نظرِ ثانی قرار دیا۔

> "اقبال نے دیباچہ کتاب میں لکھا ہے کہ ان خطبات میں اُنہوں نے مذہبی فکر کی جو جدید تشریح کی ہے وہ حرفِ آخر نہیں ہے۔ فلسفہ میں کوئی چیز قطعیت کا درجہ نہیں رکھتی، جیسے جیسے علم آگے بڑھتا ہے خیالات کی نئی شکلیں سامنے آتی ہیں"۔ (۱۹)

اعترافِ علمی سے ان کی فکری وسعت، انکساری اور اجتہادی بصیرت نمایاں ہوتی ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ مذہبی فکر ایک زندہ اور ارتقائی عمل ہے، جسے ہر دور کے نئے علمی، سائنسی اور فکری تقاضوں کی روشنی میں از سرِ نو سمجھنے کی ضرورت

رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی آراء کو حتمی حیثیت دینے کے بجائے آئندہ آنے والے اہلِ علم کے لیے تحقیق و اجتہاد کے دروازے کھلے رکھے۔ تاہم، اس فکری انکسار کے باوجود ان کے خطبات کی علمی اہمیت اور اثر انگیزی اپنی جگہ مسلم ہے۔ اقبال نے اسلامی علمِ کلام کو جدید فلسفہ، سائنس اور معاصر ذہن کے سوالات سے ہم آہنگ کرتے ہوئے ایسی مضبوط فکری بنیاد فراہم کی جس نے جدید دور میں اسلام کے عقلی دفاع اور مذہبی شعور کی تشکیلِ نو میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم نے ان خطبات کو جدید علمِ کلام کی ایک مؤثر، جامع اور عہد ساز کاوش قرار دیا ہے۔

> "علامہ اقبال کے خطبات عصرِ حاضر کا جدید علم کلام ہیں جس کی ضرورت ارباب فکر و بصیرت عرصہ سے محسوس کر رہے تھے، اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ یہ علم الکلام ہمارے قدیم علم الکلام سے بدرجہا فائق، مستحکم اور ایمان و بصیرت کو جلا بخشنے والا ہے"۔(۲۰)

۱۴۔ دیباچے کا ایک بنیادی نکتہ اجتہاد کا احیا ہے۔ اقبال کے نزدیک مسلم معاشرے کی فکری جمود کی بڑی وجہ اجتہاد کا ترک کرنا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بدلتے ہوئے معاشرتی، سیاسی اور معاشی حالات میں قرآن و سنت کی روشنی میں نئے اجتہادی فیصلے کیے جائیں تا کہ اسلام کی ابدیت اور عالمگیریت برقرار رہے۔

دیباچۂ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کا ایک نہایت اہم اور بنیادی نکتہ اجتہاد کے احیا کا تصور ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک امتِ مسلمہ کے فکری، علمی اور تہذیبی زوال کی بڑی وجوہات میں سے ایک اجتہاد کے دروازے کا عملاً بند ہو جانا اور تقلیدِ جامد کا غلبہ ہے۔ ان کے خیال میں اسلام ایک زندہ، متحرک اور عالمگیر دین ہے، جس کی تعلیمات ہر زمانے اور ہر معاشرے کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ تاہم اس رہنمائی کو مؤثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ بدلتے ہوئے حالات، نئے سماجی، سیاسی، معاشی، سائنسی اور قانونی مسائل کا حل قرآن و سنت کے ابدی اصولوں کی روشنی میں اجتہادی بصیرت کے ساتھ تلاش کیا جائے۔ اقبالؒ اجتہاد کو شریعت میں تبدیلی کا نام نہیں دیتے، بل کہ اسے اسلامی تعلیمات کے دائمی اصولوں کو عصری تقاضوں پر منطبق کرنے کا ایک علمی اور شرعی عمل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر امتِ مسلمہ تخلیقی فکر، آزادانہ اجتہاد اور علمی تحقیق کی روایت کو دوبارہ زندہ کرے تو اسلام کی ابدیت، جامعیت اور عالمگیریت نہ صرف برقرار رہ سکتی ہے بلکہ جدید دنیا کے فکری اور عملی مسائل کا مؤثر حل بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے اقبالؒ اجتہاد کو اسلامی معاشرے کی فکری تجدید، تہذیبی ارتقا اور اجتماعی حیات کی بقا و استحکام کا بنیادی ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

۱۵۔ اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کی ضرورت: دیباچہ کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ہر دور کے بدلتے ہوئے حالات نئے فکری مسائل کو جنم دیتے ہیں، اس لیے اسلامی فکر کو بھی اپنے بنیادی اصولوں کی روشنی میں نئے حالات کے مطابق از سرِ نو مرتب کرنا ضروری ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک اسلام ایک زندہ اور متحرک مذہب ہے۔ اگر اسلامی تعلیمات کو محض ماضی کی تشریحات

تک محدود رکھا جائے تو اسلام کی آفاقیت متاثر ہوگی۔ اسی لیے وہ مذہبی فکر کی تجدید (Reconstruction) کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ یہ تصور اقبالؒ کے فلسفۂ حرکت (Dynamic Philosophy) کی بنیاد ہے۔ وہ جمود، تقلید اور فکری تعطل کو امتِ مسلمہ کی زبوں حالی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تشکیلِ جدید کا مطلب دین میں تبدیلی نہیں بل کہ دین کی دائمی تعلیمات کو ہر دور کے تقاضوں کے مطابق سمجھنا اور پیش کرنا ہے۔

۱۶۔ اسلام ایک متحرک اور ارتقائی دین: اقبالؒ واضح کرتے ہیں کہ اسلام زندگی کو حرکت، ارتقاء اور مسلسل تخلیق کا نام دیتا ہے۔ قرآنِ مجید انسان کو کائنات پر غور و فکر، تحقیق اور تجربے کی دعوت دیتا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام جامد مذہب نہیں بلکہ ایک ایسا نظامِ حیات ہے جو انسان کی فکری، اخلاقی اور تمدنی ترقی کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہ نقطہ اقبالؒ کے تصورِ خودی سے بھی گہرا تعلق رکھتا ہے۔ فرد اور معاشرہ دونوں حرکت اور عمل کے ذریعے اپنی صلاحیتوں کو نکھارتے ہیں۔ اسی لیے اقبالؒ مذہب کو انسانی زندگی کی تعمیری قوت قرار دیتے ہیں۔

چناں چہ ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اقبال کی اس فکری تحریک کا حصہ بنیں اور روحانی تجربات کے ساتھ ساتھ فکر و فلسفہ کو بھی ارتقاء دیں کیوں کہ ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ علامہ اقبال خود یہی چاہتے تھے کہ ان کے بعد آنے والی نسلیں ان کے فکر و فلسفہ سے بھی بلند ہو جائیں جو اسی صورت ممکن ہے جب ہم نئی فکری منزل کی بنیاد فکرِ اقبال کی منزل پر رکھیں اور تمام تر فلسفہ و افکار پر مثبت اور تعمیری تنقید کا رویہ اپنائے رکھیں۔

علامہ محمد اقبالؒ کی کتاب "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کا دیباچہ محض کتاب کا تعارفی مقدمہ نہیں بل کہ اسلامی فکر کی تجدید اور احیاء کا ایک جامع فکری منشور ہے۔ اس میں اقبالؒ نے نہایت بصیرت کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اسلام ایک زندہ، متحرک اور آفاقی دین ہے، جو ہر دور کے فکری، سماجی، سیاسی اور سائنسی مسائل کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، بشرطیکہ اس کی تعلیمات کو قرآن و سنت کے ابدی اصولوں کی روشنی میں اجتہادی اور تخلیقی انداز سے سمجھا جائے۔

اس مقالے کے مطالعے سے یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ اقبالؒ کے نزدیک مسلم دنیا کے زوال کا بنیادی سبب اسلام کی تعلیمات نہیں بل کہ فکری جمود، تقلیدِ محض، اجتہادی روح کا فقدان، سائنسی شعور سے دوری اور قرآنِ مجید کے عملی پیغام سے غفلت ہے۔ اسی لیے وہ اسلامی الٰہیات کی ایسی تشکیلِ جدید کی دعوت دیتے ہیں جو ایک طرف اسلامی روایت اور کلاسیکی علمی ورثے سے مربوط ہو اور دوسری طرف جدید فلسفہ، سائنس اور انسانی علوم سے مثبت اور تنقیدی مکالمہ قائم کرے۔ تحقیق سے یہ نتیجہ بھی سامنے آتا ہے کہ اقبالؒ مذہب اور عقل، وحی اور تجربہ، روحانیت اور سائنس، روایت اور جدت کو ایک دوسرے کی ضد نہیں سمجھتے بل کہ ان کے درمیان ایک متوازن اور تعمیری تعلق کے قائل ہیں۔ ان کے

نزدیک اسلام انسان کو غور و فکر، تحقیق، مشاہدہ اور مسلسل عمل کی دعوت دیتا ہے، اور یہی وہ فکری بنیاد ہے جس پر ایک ترقی یافتہ، خوددار اور متحرک مسلم معاشرہ استوار ہو سکتا ہے۔

یہ دیباچہ بیسویں صدی کی اسلامی فکری تاریخ میں ایک غیر معمولی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور آج کے دور میں بھی اس کی معنویت برقرار ہے۔ عصرِ حاضر میں جب مسلم دنیا فکری انتشار، تہذیبی چیلنجز، مذہبی انتہا پسندی، سائنسی و فکری پسماندگی اور شناخت کے بحران جیسے مسائل سے دوچار ہے، تو اقبالؒ کے دیباچہ میں پیش کردہ افکار نہ صرف علمی رہنمائی فراہم کرتے ہیں بل کہ ایک متوازن، اعتدال پسند اور تخلیقی اسلامی فکر کی تشکیل کے لیے مضبوط بنیاد بھی مہیا کرتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کا دیباچہ آج بھی اسلامی فکر کی تجدید، اجتہاد کے احیا اور امتِ مسلمہ کی فکری و تہذیبی بیداری کے لیے ایک مؤثر اور قابلِ اعتماد فکری رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات

1. شعبہ اقبالیات، مرتبہ، تسہیل خطبات اقبال، اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، ۱۹۹۷ء، ص:۶
2. رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مُطالعہ، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۸ء، ص:۳۲۰
3. ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، قندیل اقبال، لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، ۲۱ اپریل، ۲۰۱۴ء، ص:۲۶۹
4. محمد شریف بقا، خطباتِ اقبال ایک جائزہ، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان۔ ۱۹۹۱ء، ص:۹
5. شعبہ اقبالیات (مرتبہ)، تسہیل خُطبات اقبال، ص:۱۴
6. محمد شریف بقا، ترجمہ و تشریح، موضوعات خُطباتِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص:۲۰۷، ۲۰۶
7. شعبہ اقبالیات (مرتبہ)، تسہیل خُطبات اقبال، ص:۱۴
8. ایضاً، ص:۱۴
9. نذیر نیازی، سید، (مترجم) تشکیل جدید الہٰیات اسلامیہ، لاہور: بزمِ اقبال، ۲ کلب روڈ، جون، ۲۰۱۲ء، ص:۳۵
10. شریف کنجاہی، پروفیسر، مذہبی افکار کی تعمیرِ نو، لاہور: بزم اقبال، ۲ کلب روڈ، نومبر ۲۰۱۵ء، ص:۹
11. شعبہ اقبالیات، مرتبہ، تسہیل خطبات اقبال، ص:۶
12. شہزاد احمد، مترجم، اِسلامی فِکر کی نئ تشکیل، لاہور: مکتبہ خلیل، جنوری، ۲۰۰۵ء، ص:۱۵
13. شہزاد احمد، مترجم، اِسلامی فِکر کی نئ تشکیل، ص:۱۵
14. شعبہ اقبالیات، مرتبہ، تسہیل خطبات اقبال، ص:۶
15. عبد الحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، تلخیص خُطبات اِقبال، لاہور: بزم اقبال، ۲ کلب روڈ، جون ۱۹۸۸ء، ص:۶
16. وحید عشرت، ڈاکٹر، مترجم، تجدیدِ فکریاتِ اسلامِ، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع اوّل، ۲۰۰۲ء، ص:۱۱
17. طاہر حمید تنولی، ڈاکٹر، تصوف اور اقبالیاتِ لاہور: پروگریسو بکس، نومبر، ۲۰۱۷ء، ص:۲۱۴
18. شعبہ اقبالیات، مرتبہ، تسہیل خطبات اقبال، ص:۷
19. الطاف احمد اعظمی، خُطباتِ اقبال ایک مطالعہ، لاہور: گنج شکر پرنٹرز، ۲۰۰۵ء، ص:۱۶
20. سعید احمد اکبر آبادی، خُطبات اقبال پر ایک نظر، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونی ورسٹی، سری نگر ۶، ۱۹۸۳ء، ص:۱۱

References :

1. Shu'bah Iqbaliyat (Murattib), Tasheel-e-Khutbat-e-Iqbal Islamabad: Allama Iqbal Open University, 1997, p. 6.
2. Rafi-ud-Din Hashmi, Dr., Tasanif-e-Iqbal ka Tahqiqi wa Tauzihi Mutala'a,Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2018, p. 320.
3. Haroon-ur-Rasheed Tabassum, Dr., Qandeel-e-Iqbal ,Lahore: Maktaba Ta'meer-e-Insaniyat, 21 April 2014, p. 269.
4. Muhammad Sharif Baqa, Khutbat-e-Iqbal: Aik Jaiza ,Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 1991, p. 9.
5. Shu'bah Iqbaliyat (Murattib), Tasheel-e-Khutbat-e-Iqbal, p. 14.
6. Muhammad Sharif Baqa (Tarjuma wa Tashreeh), Mauzu'at-e-Khutbat-e-Iqbal, Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2006, p. 206–207.
7. Shu'bah Iqbaliyat (Murattib), Tasheel-e-Khutbat-e-Iqbal, p. 14.
8. Ibid, p. 14.
9. Syed Nazir Niazi (Mutarjim), Tashkeel-e-Jadeed Ilahiyat-e-Islamia, Lahore: Bazm-e-Iqbal, 2 Club Road, June 2012, p. 35.
10. Professor Sharif Kunjahi, Mazhabi Afkar ki Ta'meer-e-Nau, Lahore: Bazm-e-Iqbal, 2 Club Road, November 2015, p. 9.
11. Shu'bah Iqbaliyat (Murattib), Tasheel-e-Khutbat-e-Iqbal, p. 6.
12. Shahzad Ahmad (Mutarjim), Islami Fikr ki Nai Tashkeel, Lahore: Maktaba Khalil, January 2005, p. 15.
13. Shahzad Ahmad (Mutarjim), Islami Fikr ki Nai Tashkeel, p. 15.
14. Shu'bah Iqbaliyat (Murattib), Tasheel-e-Khutbat-e-Iqbal, p. 6.
15. Dr. Abdul Hakim Khalifa, Talkhees-e-Khutbat-e-Iqbal, Lahore: Bazm-e-Iqbal, 2 Club Road, June 1988, p. 6.
16. Dr. Waheed Ishrat (Mutarjim), Tajdeed-e-Fikriyat-e-Islam,Lahore: Iqbal Academy Pakistan, First Edition, 2002, p. 11.
17. Dr. Tahir Hameed Tanoli, Tasawwuf aur Iqbaliyat, Lahore: Progressive Books, November 2017, p. 214.
18. Shu'bah Iqbaliyat (Murattib), Tasheel-e-Khutbat-e-Iqbal, p. 7.
19. Altaf Ahmad Azmi, Khutbat-e-Iqbal: Aik Mutala'a, Lahore: Ganj Shakar Printers, 2005, p. 16.
20. Saeed Ahmad Akbar Abadi, Khutbat-e-Iqbal par Aik Nazar, Srinagar: Iqbal Institute, University of Kashmir, Srinagar, 1983, p. 11.